مرتب: میاں محمد الیاس (راولپنڈی)

استفادہ: سید عطاء اللہ شاہ بخاری از: شورش کاشمیر

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قومی و دینی جدوجہد
ایک جائزہ ایک تجزیہ

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی ہندوستان میں مسلم اقتدار کے احیاء کی آخری متحدہ کوشش تھی۔ جو انگریزوں ۔ جدید اسلحے اور ہندوستانی ملک فروشوں کے بل بوتے پر ناکام بنادی۔ اس جہاد میں مسلم علماء و زعماء نے بڑھ چڑھ حصہ لیا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے انہیں توپوں کے دہانوں پر باندھ کر اڑادیا۔ مقدمے چلائے، پھانسیاں دیں سزائیں دی اور جائدادیں ضبط کرکے انہیں کوڑی کوڑی کا محتاج کردیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شرفاء کی بچیاں روٹی کے ایک ٹکڑے کی عوض جسم بیچنے پر مجبور ہوگئیں۔ مغل سپاہیوں اور سرکاری ملازموں کو ملازمت سے علیحدہ کردیا گیا۔ یوں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کا معاشی قتل کیا گیا۔ ملک میں نیا نظام حکومت، نیا نظام تعلیم اور نئی زبان رائج کرکے تمام تعلیم یافتہ افراد کو راتوں رات ان پڑھ بنادیا۔ اب عربی فارسی کے فضلاء و علماء کی بجائے میٹرک پاس لوگ تعلیم یافتہ سمجھے جانے لگے تھے۔

جن لوگوں نے مسلمانوں سے غداری کرکے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ یا مجاہدین آزادی کی مخبری کی تھی انہیں بڑی بڑی جاگیریں عطا کرکے کاسہ لیسوں کا ایسا گروہ تیار کردیا جو بدیشی حکمرانوں کی خوشنودی کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا۔ یہ لوگ خاندانی کہلائے۔ ان لوگوں کو سرکاری دربار میں ایک خاص مقام دیا گیا جس کے بل بوتے پر یہ اپنی جاگیروں پر دہشت اور ظلم کی علامت تھے۔ ان جاگیرداروں کی نجی جیلیں تھیں۔ جہاں یہ حریت پسندوں کو بند کردیتے اور موت ہی انہیں اس قید سے آزاد کرتی۔ بسا اوقات یہ آزادیٔ وطن کے لئے کام کرنے والے سرفروش کو انگریزوں کے حوالے کردیتے جس کے صلے میں جاگیر کی حدود اور بڑھ جاتیں۔ ضرورت پڑنے پر یہ جاگیردار اور انگریزوں کے لئے مال و دولت، سپاہی اور جسم بھی فراہم کرتے تھے۔ مختصراً یہ کہ یہ جاگیردار انگریز تو نہ تھے مگر انگریزوں کے نمبر دو یا عرف عام میں کالے انگریز ضرور تھے۔

انگریزوں نے کاسہ لیسوں اور غداروں ہی میں سے مختلف افراد کو سرکاری ملازمتیں دیں اور ان کی اس انداز سے تربیت کی کہ وہ اپنے اہل وطن کے دشمن اور انگریزوں کے بے دام غلام بنیں۔ یہ سرکاری اہل کار ہندوستانیوں کے لئے اک عذاب اور قہر بن گئے۔ ان کے اختیارات اس قدر زیادہ تھے کہ اللان ۔ ایک معمولی تھانیدار پورے شہر کو آگے لگالیتا۔ ان کی دہشت اس قدر تھی کہ ایک سپاہی دیکھ کر گاؤں بھر کے مرد چھپ جایا کرتے تھے۔

ہندوستانیوں کے "ہندوستانیت" کو قتل کرنے کے لئے یہاں انگریز نے قوم و مذہب کی بنیاد پر نفرت کا بیج بویا۔ اور پھر ان میں بار بار فساد کرایا۔ نتیجۃً کوئی بھی شخص ہندوستانی نہ رہا۔ ہندو مسلمان اور سکھ ہوگیا۔ یوں قوم واضح طور پر کئی گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ اسی فرقہ وارانہ تقسیم سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستان کے باسی انگریزوں کی بجائے اپنے ہی اہل وطن کے خون کے پیاسے ہوگئے۔

مسلمانوں کے معاملے میں انگریزوں کو بڑی کھٹک جہاد کے عنوان سے تھی کیونکہ جہاد اسلام کے جسم میں

روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریز اس سے ہمیشہ ہراساں رہے چنانچہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے روح جہاد نکالنے اور انہیں تقسیم در تقسیم کرنے کے لئے ان کے مسلکی، فروعی اور علمی اختلافات کو ابھارا اس کے لئے کئی شمس العلماء میدان میں اتارے گئے۔ جنہوں نے مسلمہ عقائد میں اختراعات کر کے انگریزی ضرورتوں کو پورا کیا۔ معذرت خواہانہ اسلام نے مسلمانوں کی معاشی کسمپرسی کا سہارا لے کر انہیں انگریز کا ذہنی غلام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انگریز ہندوستانی مسلمانوں میں صوفیاء کے مقابر و مزارات سے بھی آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے گدی نشینوں کو زمینیں الاٹ کر کے اپنا خیر خواہ بنالیا۔ بلکہ اپنی ضرورتوں کے مطابق نئی گدیاں کھڑی کیں۔

پنجاب کے حالات اس ضمن میں بدتر تھے۔ یہ صوبہ صدیوں سے فاتحین کی گزرگاہ رہا تھا۔ اور یہاں کے لوگوں کا اجتماعی ضمیر کمزور، بزدل، موقعہ پرست اور خوشامدانہ ہوچکا تھا۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں سکھ حکمران تھے۔ جنہوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی۔ چنانچہ انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی میں مسلمانوں کا اجتماعی ذہن انگریزوں کا حمایتی تھا۔ جن پنجابی مسلم گھرانوں اور خاندانوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا انگریزوں نے انہیں بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ جن لوگوں نے انگریزی خدمت کے صلے میں جاگیریں پائیں ان کا تعلق انتہائی نچلے طبقے سے تھا۔ یہ بہت چھوٹے لوگ راتوں رات بہت بڑے ہوگئے۔ انگریزوں کی نظر عنایت نے انہیں معتبر کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دین و ایمان انگریزوں کے ہاں گروی ہوچکا تھا۔ انگریزی فوج اور پولیس میں نوے فیصد ملازم اسی صوبہ سے تھے۔ بعض اضلاع کے بارے میں مشہور تھا کہ ان علاقوں کی مائیں انگریز بابا کے لئے فوجی اور سپاہی جنتی ہیں۔ انگریزوں کی سیاسی اور فوجی دہشت پنجابی جوانوں کے دم قدم سے قائم و دائم تھی۔ پنجاب انگریزوں کا بازوئے شمشیر زن تھا۔ ۱۸۵۷ء میں پنجاب کے بعض خاندانوں نے انگریزوں کی مالی اور جسمانی مدد کر کے پورے ملک کی غلامی کو استحکام بخشا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا ملک فتح کر کے انگریز کے ہاتھوں میں دیا۔ جسموں پر زمینداروں اور رزق پر سرکاری افسروں اور اہل کاروں کا قبضہ تھا۔ پیر پرستی ان کی ذہنی غلامی کا سب سے تن آور درخت تھا۔ اہل پنجاب مسلم حکمرانوں کی عملداری کے دوران مسلم صوفیاء، مبلغین کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں آئے تھے۔ اُن کا مذہب بدل گیا مگر عادتیں اور رسمیں نہ بدلیں۔ جو کام قبل ازیں دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے ہوتے تھے اب زندہ یا مردہ بزرگان دین، انبیاء و صالحین کی خوشنودی کے لئے ہونے لگے۔ خانقاہی نظام کے ماتحت پیر اور سجادہ نشین مسلمانان پنجاب کے حاجت روا اور مشکل کشا بن گئے تھے۔ کھلم کھلا قبر پرستی، ان پر رکوع و سجدہ اور طواف و نذر و نیاز اور تمام مظاہر شرک جن کے باعث اہل مکہ بدنام تھے یہاں سرعام اور بطور فخر و ناز ہوتے تھے۔ بے پیرا بے دین سمجھا جاتا تھا۔ قرآن و سنت کے داعی کو وہابی کہہ کر گالی دی جاتی تھی۔ اور اسے خاص و عام سے پٹوایا جاتا تھا اقوال مشائخ کو قرآن و حدیث پر فوقیت دی جاتی تھی سجادہ نشینوں نے یہاں جس قسم کا اسلام متعارف کرایا تھا اس کا لب لباب یہ تھا۔

۱۔ اللہ تعالیٰ معبود اعظم ہے۔ وہ سب سے بڑا بادشاہ ہے مگر اس نے نبیوں اور ولیوں کو یہ قوت، طاقت اور اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اپنے امتیوں اور عقیدت مندوں کے حالات جان لیتے ہیں۔ ان کی پکاریں سن کر دادرسی کرتے ہیں۔ وہ بعض کام خود کر دیتے ہیں اور بعض اللہ سے کروادیتے ہیں۔ وہ اللہ کے لاڈلے اور پیارے ہیں۔ جو چاہیں اللہ سے منوالیتے ہیں۔ اللہ ان کی سفارش کو رد نہیں کرتا۔ مسلمانوں کو ان کی خوشنودی حاصل کرنی چاہیے۔

جس کا بہترین طریقہ ان کے دربار میں حاضری۔ تعظیم وطواف اور نذر ومنت ہے۔

۲۔ پیغمبر ﷺ انسانی روپ میں دنیا پر آئے تھے۔ مگر درحقیقت وہ اللہ کے نور سے پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے اس کا جزو تھے۔ وہ اللہ تو نہیں تھے مگر اللہ تعالیٰ سے جدا بھی نہیں تھے۔ احد اور احمد میں صرف "میم" کی مروڑی کا پردہ تھا۔ جو لوگ انہیں بشر یا انسان سمجھتے ہیں وہ اللہ کے رسول ﷺ کے گستاخ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو خدا کے روپ میں عرش پر مستویٰ تھا۔ وہی مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر اتر آیا تھا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ عالم الغیب ہر جگہ موجود، حاضر وناظر، حاجت روا اور مشکل کشا تھے۔ بلکہ اب بھی جب کوئی امتی عشق ومحبت میں انہیں پکارتا ہے تو وہ اسکی پکار سن کر دستگیری فرماتے ہیں اور سرکار کے وسیلے سے یہ محبت تمام (زندہ ومردہ) اولیائے کرام کو حاصل ہے۔"

پیروں کے متعارف کردہ دین کے اثر ورسوخ کا یہ عالم تھا کہ لوگ پیروں کے غلام ہوگئے تھے۔ پیر کسانوں کی فصلوں سے حصہ وصول کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ پیر صاحبان کی خوشنودی کے لئے اپنی بہو بیٹیاں تک ان کی نذر کر دیتے تھے۔

یہ "خانقاہی نظام" اس قدر مضبوط تھا کہ کوئی شخص اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اس نظام کو للکارنا موت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ یہ نظام انگریزوں کے لئے بہت سود مند ثابت ہوا۔ انہوں نے صرف اسے قائم رکھا بلکہ اسے مزید مضبوط کیا اور نئی گدیاں قائم کیں۔ ان پیروں نے پہلی جنگ عظیم میں اپنے مرید ہزاروں کی تعداد میں انگریزی فوج میں بھرتی کرائے۔ ان کو امام ضامن باندھے، انہیں تعویذ دیئے کہ ترکوں کی گولیاں ان پر اثرانداز نہ ہونگی خواہ وہ کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی پر گولیاں چلائیں۔ جب خلافت عثمانیہ ختم ہوگئی تو پیران پنجاب نے صوبہ کے گورنر سر مائیکل اڈوائر کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرکے انگریزوں کی فتح اور ترکوں کی شکست پر ہدیہ تبریک پیش کیا تھا۔ مسلمانوں کو ملی وحدت، روح جہاد اور شوق شہادت سے محروم کرنے کے لئے انگریزوں نے ایک اور فتنہ کھڑا کیا اور یہ غلام احمد قادیانی تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپ کی ختم نبوت پر براہ راست حملہ کیا۔ سیالکوٹ کی ضلع کچہری کے عرضی نویس مرزا غلام احمد قادیانی کو پہلے پہل مناظر اسلام کے روپ میں سامنے لایا گیا۔ اسکی پبلسٹی پر ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کیے گئے۔ مرزا نے بتدریج مجدد، مہدی، مسیح موعود ہونے کے دعوے کرکے قوم اور علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ لایعنی مباحث چھیڑ کر اخبارات و جرائد میں غلغلہ مچایا۔ بالآخر نبوت کا مدعی بنا۔ مرزا کی تعلیمات کا خلاصہ یہ تھا کہ

"انگریز اللہ تعالیٰ کی مقبول اور محبوب قوم ہے۔ مسلمانوں کو ان سے وفاداری کرنی چاہیے۔ ان کی اطاعت فرض ہے اور وہ اولی الامر ہیں۔ جہاد منسوخ ہو چکا ہے اور ہندوستان دارالاسلام ہے" (ضرورت الامام ص ۲۳)

پنجاب میں ایک اور بڑا عنصر شیعوں کا بھی تھا۔ وسطی اور جنوبی پنجاب میں جاگیرداروں کی اکثریت شیعہ مذہب سے وابستہ تھی۔ کئی سجادہ نشین بھی شیعہ تھے یہ سجادہ نشین اور جاگیردار ان ذاکروں کے پشت پناہ تھے جو خلفاء ثلاثہ اور اصحاب رسول علیہم الرضوان پر سب وشتم کرکے انگریزی مقاصد کی تکمیل کرتے تھے۔ ان حالات میں کسی استعمار دشمن تحریک کا آغاز کرنا، کسی تنظیم کو منظم کرنا اور دشمن کی تہ در تہ اور پیچ در پیچ سازشوں کو طشت از بام کرنا اور ان کا توڑ پیدا کرنا..... کسی معجزے کے بغیر ناممکن لگتا تھا لیکن یہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی

خطابت، حریت پسندی، حب الوطنی، حق گوئی اور بے باکی کا اعجاز تھا کہ انہوں نے پنجاب جیسے صوبہ میں انگریزی استعمار کے مخالف، قادیانی نبوت کے نقاد، شرک و بدعت کے قاطع اور عظمت صحابہ کے متوالے سرفروش تیار کر دیئے تھے۔ اسلام کی تاریخ ہمیشہ ان کی شکر گزار رہے گی کہ ایک تنہا شخص نے ایک ذہن اور مزاج تیار کر دیا تھا۔

شاہ جیؒ کی عملی زندگی کا آغاز امرتسر کی مسجد خیر الدین میں امامت سے ہوا۔ ان کی خوش الحانی اور حسنِ قرأت نے رنگ دکھایا اور لوگ دور و نزدیک سے اس مسجد میں آنے لگے۔ شاہ جیؒ ترکِ بدعات اور اصلاحِ رسوم کے موضوعات پر وعظ کہتے تھے اور ان کی خوش بیانی نے پورے شہر کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی انہیں سیاست میں کھینچ لائے۔ پہلی سیاسی تقریر خلافت کانفرنس امرتسر (۱۹۲۰ء) میں کی۔ اور اگلے ہی سال کانگریس کی کلکتہ کانفرنس میں اس معرکے کی تقریر کی کہ ان کی خطابت کی دھاک بیٹھ گئی اور ان کا شمار ملک بھر کے صف اوّل کے قائدین میں ہونے لگا۔

اب شاہ جی کا وقت عروج تھا۔ چار سُو ان کی خطابت، جرأت، حق گوئی اور بے باکی کی دھوم تھی۔ ہندوستانی عوام بلا استثنائے مذہب ان کی خطابت کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی خطابت کے زور سے ہندوستانی عوام کے دلوں سے انگریزوں کا خوف نکال دیا تھا۔ وہ تحریک آزادیٔ ہند کے مجاہد تھے۔ اور اس راہ میں ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ انگریز مجاہدین آزادی کو پس دیوار زنداں بھیج دیا کرتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجموعی طور پر عمر عزیز کے دس سال آزادیٔ وطن پر قربان کیے۔ پہلی بار ۱۹۲۱ میں تین سال کے لئے گرفتار ہوئے۔ ۱۹۲۴ میں رہائی ہوئی۔ راجپال کے فتنہ توہین رسالت مآب لالہ موسے کا مقدمہ بغاوت، تحریک قادیانیت اور جنگ عظیم دوم میں گرفتاریاں اس پر مستزاد ہیں۔ جو مجموعی طور پر دس سال بنتی ہے۔ شاہ جی کا اپنی زندگی کے بارے میں یہ جملہ بہت مشہور ہوا۔

"زندگی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی ایک چوتھائی جیل کی نذر ہو گئی۔"

۱۹۲۷ سے ۱۹۳۰ تک کے چار سال شاہ جی کی زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سالوں میں بعض ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جنہوں نے انہیں قومی قیادت کی پچھلی صفوں سے اٹھا کر اگلی صفوں میں بٹھایا۔ اور وہ اپنے ہم عصر علماء و زعماء سے منزلوں آگے نکل گئے۔ ان واقعات میں فتنۂ راجپال کے خلاف احتجاجی جلسے میں ان کی انتہائی جذباتی تقریر، ۱۹۲۹ میں مجلس احرار اسلام کی تشکیل اور ۱۹۳۰ میں انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ جلسہ میں ان کا "امیر شریعت" کی حیثیت سے انتخاب اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری سمیت پانچ سو جید علماء کی بیعت اطاعت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۲۹ میں انہوں نے مختلف مکاتب فکر کے علماء کے ساتھ مل کر مجلس احرار اسلام کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن گئی۔

انگریزوں نے ہمیشہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" (Devide & Rule) کے فلسفے پر عمل کیا۔ مسلمانوں کی ملی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے فروعی اور علمی اختلافات کو ہوا دے کر کئی فرقے پیدا کر دیے اور انکی مسلسل آبیاری کی۔ نتیجتہً ان مکاتب فکر کے درمیان بہت سی خلیجیں حائل ہو گئیں۔ سنی، وہابی، مقلد و غیر مقلد، دیو بندی، بریلوی مناقشت نے انگریزی فلسفہ کو کامیاب کر دکھایا تھا۔ شاہ جی نے اس سازش کو ناکام بنانے کے لئے

تمام مکاتب فکر کے روشن خیال اہل علم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور مجلس احرار اسلام کے نام سے ایسی تنظیم ترتیب دی جس میں تمام مکاتب فکر شانہ بشانہ کھڑے نظر آئے۔ اس جماعت میں شاہ جی اور ان کے کئی دوسرے ساتھی مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا غلام غوث ہزاروی دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اہل حدیث تھے اور صاحبزادہ فیض الحسن بریلوی مکتب فکر کے چشم و چراغ تھے جبکہ مولانا مظہر علی اظہر اور سید مظفر علی شمسی شیعہ مکتب فکر سے متعلق تھے۔

قائد احرار کی حیثیت سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا سیاسی اور تبلیغی سفر تقریباً ربع صدی تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں ان کی جماعت نے انتہائی عروج بھی دیکھا اور زوال بھی۔ سیاسی فتح مندیاں بھی پائیں اور زبردست شکستیں بھی دیکھیں۔ مگر احرار لیڈروں کی جرأت و استقامت اور مغربی استعمار سے نفرت ہمیشہ اٹل رہی۔ احرار نے کئی تحریکوں کو جنم دیا۔ تحریک کشمیر، تحریک مسجد شہید گنج، تحریک محاسبہ قادیانیت، تحریک تحفظ ختم نبوت اور تحریک مدح صحابہ احرار کے کریڈٹ پر ہیں۔ اور ان تحریکوں نے ملکی سیاست پر گہرے اثرات و نقوش ثبت کیے۔ احرار نے دوسری جنگ عظیم میں فوجی بھرتی کے خلاف بھی آواز بلند کی اور حکومتی عتاب سہا وہ تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ مگر آزادیٔ ہند سے بے پناہ مخلص تھے۔ بلکہ اس باب میں بے مثال تھے۔ مسلمان قوم نے شاہ جی اور ان کے ساتھیوں کی سیاسی رائے کو رد کرتے ہوئے تقسیم ہند کے فارمولے پر صاد کیا اور ۱۹۴۷ میں ملک تقسیم ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں بہت بڑی تعداد میں انتقال آبادی ہوا۔ شاہ جی امرتسر سے اٹھ کر ملتان آ گئے۔ اور انتخابی سیاست سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو گئے۔ بڑھاپے، بیماری اور ضعف و ناتوانی کے باوجود قادیانیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے خلاف ۵۳-۱۹۵۲ میں ختم نبوت کے تحفظ کی تحریک منظم کی جسے خواجہ ناظم الدین کی حکمرانی میں اس وقت کی مسلم لیگی حکومت نے بزور کچل کر مجلس احرار اسلام کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ لیکن شاہ جی عمر کے آخری سانسوں تک قادیانی نبوت کا ذبہ کا محاسبہ کرتے رہے۔

شاہ جی کی سیاسی، قومی اور دینی خدمات کو ان کے عہد اور اس عہد کے حالات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو بلاتامل کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس عہد کے پنجاب میں اللہ اکبر کی صدا تھے۔ وہ قدرت کا ایک عطیہ تھے اور انہوں نے عطیۂ الٰہی ہونے کا حق بھی ادا کیا۔ انہوں نے اس وقت آزادیٔ وطن کا نعرہ لگایا جب اس کا سیدھا سیدھا مطلب خود کشی سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک آفتاب تھے جو تحریک خلافت میں طلوع ہوا اور تحریک تحفظ ختم نبوت میں غروب ہوا۔ اس اعتبار سے اتحاد امت ان کی جدوجہد کا اصل منشا تھا۔ شاہ جی نے پنجاب اور ہندوستان کے اس ماحول میں جو خدمات سرانجام دیں۔ انکا خلاصہ یہ ہے کہ

انہوں نے مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کے لئے گرانقدر کام کیا۔ عمر کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کو کلمۂ اسلام سکھانے، سمجھانے اور اس کے معانی و مطالب بیان کرنے میں گزرا۔

آغا شورش کاشمیری نے اپنی خود نوشت میں بڑے خوبصورت الفاظ میں احرار کی وکالت کی ہے وہ لکھتے ہیں

"احرار کی خوبیاں قدرت کا العام تھیں۔ دنیا نے ان کے بارے میں سبھی کچھ کہا ہے لیکن تاریخ ان کے بارے میں ابھی صحیح تجزیہ نہیں کر سکی۔ ہار جانا کوئی شے نہیں اصل شے لڑ جانا ہے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ

بقیہ ۳۹ پر